© rasailojaraid.com

فخر الدین صدیقی ۔ ایم اے ۔ ایل ایل بی ایڈوکیٹ

اقبال کا فلسفۂ خودی و بیخودی

جس طرح گیتا نجلی سے ٹیگور کی دھاک مغربی دنیا میں بندھی، اسی طرح اسرار خودی نے چار دانگِ عالم میں اقبال کا ڈنکا بجا دیا۔ اس مثنوی میں اقبال نے انفرادی زندگی کے حقائق بیان کیے ہیں۔ نشو و نما اور استحکام کے اصول بتائے ہیں اور دنیا کو جو اندھیرے میں بھٹک رہی تھی منزلِ مقصود کی راہ دکھائی ہے۔ دنیا کا اعرابی ترکستان کی راہ پر ہو لیا۔ اسے کعبے کی شاہراہ کا پتا دیا ہے اور بتایا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد متاعِ تن آسانی کا اکٹھا کرنا نہیں بلکہ نیابتِ الٰہی ہے۔ گویا اقبال خودی کے سرچشمے سے جوئے زندگی نکال کر لایا ہے اور ہر کہ دمہ کی تشنہ کامی کو اس کے آبِ حیات سے دور کر دینے کا آرزومند ہے۔

اس نے نہ صرف خودی کے استحکام ہی پر زور دیا ہے بلکہ رموزِ بیخودی میں افرادِ ملت کے باہمی تعلقات سے بھی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ضرورت کے وقت ملت کی خاطر جان دے دینا بھی عین زندگی ہے۔ کیا خوب کہا ہے:

مسلمانی غم دل در خریدن چوں سیماب از تپ یاراں تپیدن
حضورِ ملت از خود در گذشتن دگر بانگ انا الملت کشیدن

فطرت "لہو ترنگ" ہے "حل ترنگ" نہیں اور اقبال اس بات کا قائل ہے کہ خودی کو ہر حال میں اور ہر قیمت پر قائم رکھنا ضروری ہے یہاں تک کہ اگر اس سلسلے میں سنگدل بھی ہونا پڑے جائز ہے کیونکہ

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا لہو گرم کرنے کا ہے اک بہانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اگر ملت کا مفاد خودی کے بلیدان کا تقاضا کرے تو بے خودی سے سرشار ہو کر اپنے آپ کو قربان کر دینا چاہیے۔ یہ مطالب اسرار و رموز میں مسلسل طریق پر بطور حکیمانہ بحث کے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن باوجود خشک مضمون کے بھی شاعرانہ چاشنی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔ مثنوی کے علاوہ دیگر منظومات میں بھی اقبال نے انہیں نغموں سے گوش ہوش کی تواضع کی ہے گو بظاہر مثنوی میں مسلمان سے خطاب کیا گیا ہے اور ملت اسلامیہ کو قابل تقلید نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ دعوت صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ دنیا بھر کے یاران نکتہ داں کو صلائے عام دی گئی ہے اور مسلم آئین ہو جانے کی تائید کی گئی ہے زندگی کائنات کی گھٹی میں پڑی ہے اور تمام ذی روح اجسام میں موجود ہے لیکن انسان کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ قلب و دانش کا مالک ہے۔ اس لیے زندگی کا فن اس بات کا مقتضی ہے کہ انسانی قوی خواہ روحانی ہوں یا حواسی، پوری نشو و نما حاصل کریں تاکہ انسانی فطرت کو زیر کر کے صحیح معنوں میں خدا کا نائب بن سکے۔

پس یہ جاننا ضروری ہے کہ فرد کا فرد کے ساتھ، ملت کا اپنے افراد کے ساتھ اور قوم کا دوسری قوم کے ساتھ کیا تعلق ہے اور اس تعلق کو کس خوش اسلوبی کے ساتھ بڑھایا اور قائم رکھا جا سکتا ہے۔ گویا زندگی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، جس کی الجھنوں کو سلجھانے کے لیے اخلاقی، سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کو بڑی کوشش اور کاوش سے کام لینا پڑا۔ ان اہم مسائل نے اقبال کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور اس نے بھی اپنے رنگ میں ان کا حل پیش کیا ہے۔ افراد کی نشو و نما چاہی ہے۔ اور ایک ایسی چاک و چوبند ملت کی بنیاد ڈالی ہے، جس کی جیتی جاگتی تصویر ملت اسلامیہ کے رنگ میں موجود ہے، جس طرح بین الاقوامی میدان میں اس نے جوع الارض اور ممالک کی لوٹ کے خلاف علم جہاد بلند کیا ہے۔ قومیت کے موجودہ تصور کے پرخچے اڑائے ہیں وطنیت حاضرہ کے لتے لیے ہیں اور اقوام عالم کو پاس عہد کی تلقین کی ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم انفرادی زندگی کے متعلق اقبال کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک کائنات محدود اشیاء کے مجموعے کا نام ہے جو یا تو باشعور خودی کی مالک ہیں یا بے شعور مادے کی مظہر ہیں لیکن ان دونوں کا انحصار اس تیسری ہستی پر ہے جسے خدا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اقبال زندگی کو ایسی حقیقت خیال نہیں کرتا کہ جس کی تکمیل ہو چکی ہو بلکہ اسے نامکمل خیال کرتا ہے۔ جس کی تکمیل ہو رہی ہے۔ کہتا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید ‏ ‏ کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُن فیکون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقبال کائنات کی ہستی کو مطلق نہیں بلکہ اضافی سمجھتا ہے اور خودی کو ایک ایسا سرچشمہ خیال کرتا ہے، جس میں غیر خودی تو جہاں ہے یہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں کیا خوب کہا ہے ؎

ہستی و نیستی از دیدن و نا دیدنِ من
چہ زماں و چہ مکاں شوخیِ افکارِ من است

اقبال کی نگاہ میں تمام زندگی انفرادی ہے۔ یہاں تک کہ خود خدا بھی ایک فرد ہے۔ یگانہ و یکتا اور انفرادی خودی ہی حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔ باقی کائنات مجاز ہے خودی اور اس کی حیات ہی ایسے روشن حقائق ہیں جو "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کے مصداق ثبوت کی ضرورت سے بے نیاز ہیں اور اگر کہیں خودی کی ہستی میں شک و شبہ پیدا ہو جائے تو خود شک کرنے والی ہستی کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ "وہ" کے سلسلے میں شاید چون و چرا کی گنجائش ہو لیکن "میں" کا باوا آدم نرالا ہے اور ہر کس و ناکس سے اپنا آپ منوا کر ہی چھوڑتی ہے۔ اقبال کے نزدیک جب خودی بیدار ہوتی ہے۔ تو فہم و شعور کا خوش منقاد طائر چہکنے لگتا ہے۔ گویا خودی کی بیداری شعور کا باعث ہے اور شعور کو قائم رکھنے کا ذریعہ تغیرات ہیں جو بیرونی دنیا میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ضروری ہے کہ خودی غیر خودی کو وضع کرتی رہے تاکہ ایک ہی نقشے کا ماحول بے شعوری کی کیفیت طاری نہ کر دے۔ فرمایا ہے

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد | بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوشش است | بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

اقبال نے اس شعور کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک کا منبع ذہن اور دوسرے کا سرچشمہ قلب۔ حواسِ خمسہ غم اور خوشی۔ فہم و ادراک سو منات ذہن کے پجاری ہیں لیکن جذبۂ عشق وہ محمود ہے جو قلب کے طواف میں مصروف ہے۔ ذہنی قویٰ سے لذاتی خواہشات کی تشکیل ہوتی ہے اور قلب سے عرفان کی وجد آور کیفیات پیدا ہوتی ہیں محمودِ عشق قدم قدم پر ایازِ ذہن کو "قدر خود بشناس" کی یاد دلا کر قابو میں رکھتا ہے اور کہتا نظر آتا ہے ؎

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر

خودی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ نمود و ظہور کی آرزومند رہتی ہے اس لیے نئے نئے مقاصد معرضِ وجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں آتے ہیں اور اسے قبر کا ڈھیر بن کر رہ جانے سے روکتے ہیں۔ آرزوئیں خودی کو حسن کی لنکا ڈھانے پر آمادہ کرتی ہیں۔ خودی عشق جیسے سالار کو اس کام پر مامور کرتی ہے جو اپنا لاؤ لشکر لے کر فطرت کے نگارخانے پر دھاوا بول دیتا ہے اور بالآخر اسے فتح کر کے خودی کی ملکیت میں شامل کر دیتا ہے۔ اسی طرح ذہنی قوئی بسا اوقات وفورِ ہوس کے باعث بے تکی ہانکنے لگتے ہیں۔ لیکن عشق کا مُطرب ان آوازوں میں ربط و ضبط قائم کر کے سُر تال سے اس بے تکے پن کو دل آویز ترنم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اقبال خودی کو زندگی کا لازمہ خیال کرتا ہے۔ اسے مضبوط بنانے کے لیے گلشنِ فطرت میں قتل و غارت کا ہنگامہ بپا کرتا ہے اور دل آویز چنگیزی کی تعلیم دیتا ہے جس کے مصرعے مصرعے سے خون ٹپکتا نظر آتا ہے لیکن اس اٹل قانونِ قدرت سے کسی کو انکار کی مجال نہیں کہ ہر بڑی شے چھوٹی کو لقمہ بناتی ہے اور ہر زبردست چیز کمزور کو لقمہ۔ ایک کا اوج دوسرے کی پستی ہے اور ایک کی بربادی دوسرے کی آبادی کا باعث ہے۔ کسی کی خانہ بربادی ہے اور کسی کا گھر بنتا ہے۔ بت خانہ بگڑتا ہے، کعبہ بنتا ہے۔ سورج نکلتا ہے تارے ڈوبتے ہیں۔ الغرض یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ اقبال کا یہ نظریہ بدن پر لرزہ طاری کر دینے کے لیے کافی ہے۔

اقبال خودی اور خود افزائی کا اس قدر والہ و شیدا ہے کہ نفیٔ خودی کے مسئلے کو کمزور بھیڑوں کے دماغ کی اختراع سمجھتا ہے۔ جنہوں نے دیکھا کہ بھیڑ میں شیر کے اوصاف تو پیدا ہونے سے رہے البتہ شیر سے گوشت کا چسکا چھڑا کر اُسے اپنے ڈھب پر لایا جا سکتا ہے۔ اس لیے مکار گوسفند نے چرب زبانی سے کام لیا اور یوں گویا ہوا ؎

ہر کہ باشد زور آور شقی است — زندگی مستحکم از نفیٔ خودی است

روحِ نیکاں از علف یابد غذا — تارک اللحم است مقبولِ خدا

اے کہ مے نازی بذبح گوسفند — ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ اقبال انسان نہیں درندے چاہتا ہے وہ محض مجاہد بنا دینے کا آرزومند ہے اور ذوقِ تن آسانی سے بچانا چاہتا ہے تاکہ جھپٹے، جھپٹ کر پلٹے اور اس طرح اپنے خون کو گرم رکھے۔ مصروفِ پیکار ہو۔ قوئی کی پرورش کرے اور بالآخر کامل انسان بن کر فطرت کی طاقتوں کو قابو میں لے آئے۔ اقبال کس طرح کا انسان چاہتا ہے؟

ذیل کی رباعی سے واضح ہوگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے　　تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلِ دردآشنائے　　چو جوئے در کنارِ کوہسارے

اقبال ایسے انسان کی آمد کا کس اشتیاق سے منتظر ہے۔ ملاحظہ ہو!

تو شمشیری ز کامِ خود بروں آ　　بروں آ از نیامِ خود بروں آ
نقاب از ممکناتِ خویش برگیر　　مہ و خورشید و انجم را بہ برگیر

خودی کی تربیت کا انحصار تمام تر اس علمی اور ادبی فضا پر ہے جو سماج میں خیالات کی اشاعت کا باعث ہوتی ہے اور کیریکٹر کی تشکیل پر زبردست اثر ڈالتی ہے۔ مشہور انگریزی مقولہ ہے کہ:

"نغمہ طرازی کا کام مجھے سونپ دو پھر اس بات کی پرواہ نہیں کہ حکومت کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے۔"

گویا نصابِ تعلیم جس کے اختیار میں ہو۔ دل و دماغ پر اسی کا راج ہوتا ہے۔ انگریز جرنیل نے کیا خوب کہا تھا۔

"واٹرلو کی لڑائی ہم نے مدرسۂ ایٹن کے میدان میں جیتی۔"

اقبال بھی خیالات کے اثر سے بخوبی واقف ہے اور اپنے تعمیری پروگرام میں سب سے پہلے علم و ادب کا معیار قائم کرتا ہے جو اس کی تمام اخلاقی تعلیم کی بنیاد ہے جو لٹریچر اس کسوٹی پر پورا اترے وہ اچھا اور جو کم عیار نکلے وہ برا۔ ضربِ کلیم میں "خوب و زشت" کے عنوان سے کیا خوب معیار پیش کیا ہے۔ فرمایا ہے ؎

ستارگانِ فضا ہائے نیلگوں کی طرح،
تخیلات بھی ہیں تابع طلوع و غروب،
جہاں خودی کا بھی ہے صاحبِ فراز و نشیب
یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب
نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب

افلاطون نے بھی اپنی کتاب "جمہوریت" میں علم و ادب کا معیار قائم کیا ہے لیکن اس کے اندر وہ لٹریچر بھی شامل ہے جو افیون کی جسکی کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن اقبال کا معیار ایسے خرابی نواز عنصر سے پاک ہے اور اس شعر میں بیان کر دیا گیا ہے ؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن　　بر عیارِ زندگی او را بزن

گویا جس لٹریچر سے خودی پروان چڑھے وہ اچھا اور جس سے اس میں ضعف آئے وہ برا۔ اسی لیے آج کل کے نظامِ تعلیم سے سبق لیتے ہیں کہ اس سے خودی ضعیف ہو جاتی ہے۔ فرمایا ہے ؎

جوانے خوش گلے رنگیں کلاہے　　نگاہِ او چو شیراں بے پناہے
بہ مکتب علمِ میشی را بیاموخت　　میسّر نایدش برگِ گیاہے

اقبال موجودہ طرزِ تعلیم سے حد درجہ بیزار ہے اور جا بجا اس کی خامیوں کو بے نقاب کرتا رہتا ہے ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے　　سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے　　قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو　　کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں
گیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا　　صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ
بایں مکتب بایں دانش چہ نازی ؟　　کہ ناں در کف نداد و جاں ز تن بُرد!

اقبال نے ادبیات کی اصلاح کی خاطر اسرارِ خودی میں ایک علیحدہ عنوان قائم کیا ہے اور اس کے ماتحت اپنے خیالات وضاحت کے ساتھ پیش کر دیے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اس افلاطونیت سے بیزار ہے جس نے زندگی کو ایک سراب میں تبدیل کر دیا ہے۔

جب کاشت ہونے لگتی ہے تو پہلے زمین کو خس و خار سے پاک کیا جاتا ہے۔ پھر ہل چلایا جاتا ہے اور دانے بوئے جاتے ہیں۔ اقبال نے بھی خودی کی زمین میں بلند اخلاق کا بیج بونے سے پہلے خس و خار کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہتا ہے ؎

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس　　حریّت از عفّتِ فکر است و بس
پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر　　بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

اسی لیے اقبال نے پہلے برائیوں کا قلع قمع کیا ہے اور پھر اپنی تعمیری اسکیم کا ڈھانچہ پیش کیا ہے۔ سب سے بڑھ کر ناتوانی اقبال کی نظر میں کھٹکتی ہے۔

گویا یہ برائیاں بھی حقیقت میں ناتوانی ہی کی آوردہ و پروردہ ہیں جہاں ناتوانی ہے وہاں برائیاں ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں اس سے پیچھا چھڑایا خودی کو استوار ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔ اقبال دستِ سوال دراز کرنے کو نہایت مذموم خیال کرتا ہے۔ جو شئے اپنی جدّ وجہد سے حاصل نہ ہو وہ سوال کے مفہوم میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ اگر اپنے خون سے ہولی کھیلے بغیر سلطنت بھی مل جائے تو وہ باعثِ ننگ وعار ہے اور تو اور اقبال تو ہمیں باپ کے ترکے سے بھی بہرہ اندوز نہیں ہونے دیتا۔ کس بے نیازی سے کہتا ہے ؎

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی   کجا عیشِ برون آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

گویا اقبال اسی لہر پر سے سو جیحون قربان کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جو طوفان کی امداد لیے بغیر اٹھے اور اسی ذرّے پر سے سو سورج تصدق کرتا نظر آتا ہے۔ جس کی چمک دھوپ کی مرہونِ احسان نہ ہو۔ سوال انتہائی ضعف کی نشانی ہے اور ہمسائے کی وساطت سے بہشت حاصل کرنا دوزخ کے عذاب سے کم نہیں۔ اقبال تو اس خوددار جوانمرد کا قائل ہے جو منزل پر پہنچ کر بھی منزلِ مقصود کا احسان نہ اٹھائے اور اس سے منہ پھیر لے کیا خوب کہا ہے ؎

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

مرد وہی ہے جو تکلیف برداشت کرے لیکن دستِ سوال دراز نہ کرے۔ فرمایا ہے ؎

اے خنک آن تشنہ کاندر آفتاب
مے نخواہد از خضر یک جامِ آب

ایک تو پیاسا دوسرا سورج کے آتشکدے میں اور پھر بھی خضر سے پانی کا ایک جام تک نہ مانگے بے نیازی کی انتہا ہے اور ایسے شخص کو اقبال اس لیے قابلِ رشک سمجھتا ہے کہ اس کی پیشانی پر سوال کی ندامت کا پسینہ نمودار نہیں ہوتا۔ وہ مضروب ہونے سے نہیں گھبراتا لیکن اوروں سے مومیائی مانگنا اپنی توہین خیال کرتا ہے۔ گویا

ع   مرجائیے نہ نازِ مسیحا اٹھائیے

اسی طرح جب یومِ اقبال کے موقع پر حضور نظام کے توشہ خانے سے ایک ہزار کا چیک بطور تواضع موصول ہوتا ہے تو شاعر کی عزت کا دریا جوش میں آجاتا ہے۔ وہ خدا سے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:-

" اللہ تعالیٰ تو نے مجھے شہنشاہی عطا کرنے کا فیصلہ کیا میں اس بار کو اٹھا تو لیتا لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب ارشاد ہوا کہ خدائی کی زکوٰۃ ہے تو میرے فقر کی غیرت نے قبول نہ کیا اور میں نے بادشاہ بننے سے انکار کر دیا۔"

کیوں نہ ہو اقبال ہی کو یہ شان ہے کہ ایسا کرے۔

اقبال سوال سے اس قدر متنفر ہے کہ اس کے ساغر چھونا تک بھی اسے گوارا نہیں یہاں تک کہ تشبیہ تک کا احسان اٹھانا بھی اسے منظور نہیں۔ جہاں بین اقبال جیسے صاحب نظر کی گھٹی میں پڑی ہے۔ لیکن یہاں بھی وہ بے نیازی کی شان کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ کہتا ہے ؎

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

جو مغرب زدہ لوگ یورپ کی نکل اڑاتے ہیں۔ اقبال ان کے لیے تازیانہ ہے وہ چہرے پر غازہ غیر کے استعمال کو گداگری گردانتا ہے اور دوسرے کے تراشے ہوئے بتوں کا پوجنا مذموم خیال کرتا ہے۔ یہاں تک کہ زمانے کی ناسازگاری دیکھ کر اپنی دنیا دینا اور زمانے کا رنگ اختیار کر لینا بھی اقبال کی نظروں میں نامساعد جہاں کا مرہونِ احسان ہونا ہے "جیسا دیس ویسا بھیس"۔ ایک مشہور مقولہ ہے لیکن اقبال کو اس میں سے بھی سوال اور ضعف کی بو آتی ہے اور جہاں لوگ حالات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو کہتے ہیں۔ وہاں بجائے جھکنے کے وہ ہمیں حالات کو جھکا لینے کی تعلیم دیتا ہے۔ کہتا ہے۔

حدیثِ بے خبراں است" با زمانہ بساز"
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

وہ خلیفۂ ثانی کی طرح اونٹ سے اتر آنے کو کہتا ہے۔ اور اس تاریخی واقعہ کو یاد دلاتا ہے۔ جب عمرؓ بیت المقدس کا دخل حاصل کرنے کے لیے بہ نفس نفیس وہاں تشریف لے گئے تھے۔ اونٹ ایک تھا۔ باری باری آقا اور غلام مدینہ سے چڑھتے اترتے چلے آ رہے تھے۔ جب بیت المقدس کے قریب پہنچے تو غلام کے سوار ہونے کی باری تھی۔ خلیفہ نے اترنا چاہا۔ غلام نے عرض کی کہ وہ سوار ہی رہیں۔ لیکن غلام کا یہ احسان بھی گوارا نہ ہوا اور خلیفہ اترے۔ غلام کو سوار کیا اور اونٹ کی مہار تھامے، مساوات کی یہ شان دکھاتے ہوئے دروازے پر پہنچے اور دنیا کو اس بے نیازی سے حیرت زدہ بنا دیا۔ اس واقعہ کو اقبال نے یہ شعر کہہ کر ہمیشہ کے لیے اقلیم سخن کی ملک بنا دیا ہے ؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خود فرو آ از شتر شلِ عمرؓ
الحذر از منتِ غیر الحذر

اقبال کے تعمیری پروگرام کی بنیاد خودی ہے جس کی نشوونما کا انحصار مقصد اور نصب العین پر ہے۔ مطلوب ہو گا تو آرزوئیں پیدا ہوں گی اور لَو لگے گی۔ اشتیاق بڑھے گا اور جنوں کا درجہ حاصل کرلے گا اور طالبِ محبت کے بل بوتے پر دیوانہ وار منزل کی طرف گامزن ہو گا۔ اقبال کا نصب العین نیابت الٰہی ہے۔ جس کے حصول کے لیے وہ تربیت کے اصول وضع کرتا ہے تاکہ خودی تربیت پاکر فطرت کو مسخر کرنے کے قابل ہو سکے۔ اسی لیے وہ عشق کو اہمیت دیتا ہے جس کی تاثیر سے مردہ زندہ اور زندہ زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔ گویا زندگی تسخیر کا مضمون ہے اور آرزو اس مقصد کے حصول کے لیے اسم اعظم کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ آرزو جو گرماتی ہے تڑپاتی ہے۔ جلاتی ہے خود فرشتے بھی اسی آگ سے بھڑک اٹھنے کے آرزومند ہیں۔

اقبال جدوجہد ہی کو نعمتوں کا پیش خیمہ سمجھتا ہے لیکن کیا وہ محنت کا پھل بھی اٹھانا چاہتا ہے یا نہیں۔ کیا وہ اپنی آرزوؤں کو پورا ہوتے دیکھنے کا خواہش مند بھی یا اس شعر کا مصداق ہے ؎

کر بیٹھے وصلِ یار کی بھولے سے ہم دعا
یارب یہ دعا ہو کہ جس میں اثر نہ ہوا

ہمارا جواب یہ ہے کہ وہ "سعی بے حاصل" کو زندگی کا اصل اصول سمجھتا ہے اور ہجر و فراق ہی کا قائل ہے۔ کیا خوب کہتا ہے ؎

خودی را کُشتن ز نورِ کبریائی است — رسائی ہائے او از نارسائی است
جدائی از تمامات وصالش — وصالش از مقاماتِ جدائی است

اس کی رسائی اور نارسائی کا سلسلہ لامتناہی ہے اور وہ سفر میں کہیں ٹھہرنے سستانے کا نام ہی نہیں لیتا۔

آج کل کے تمدن نے تن آسانی کو نصب العین قرار دے لیا ہے۔ اور ہر اس شے سے بچنے کی کوشش کی ہے جس میں خطرے اور تکلیف کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے اور یہ ذوقِ تن آسانی ضعفِ خودی کی زبردست دلیل ہے۔ کہاں آسائش کا چسکا اور کہاں غم کا چسکا۔ دونوں زاویہ ہائے نگاہ میں قطبین کا فرق ہے۔ پہلا ارزاں ہے دوسرا کمیاب۔ کیا خوب کہا ہے ؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

خودی کی تربیت کے سلسلے میں اقبال نے تین مرحلے بتلائے ہیں جن میں سے پہلا مرحلہ اطاعت شعاری ہے۔ اقبال کو بے لگامی نہیں بھاتی اور مادر پدر آزاد نوجوانوں سے اسے نفرت ہے۔ وہ تو آئین و قیود کی پابندیوں کو اختیار کی پہلی سیڑھی خیال کرتا ہے۔ گویا قانون اور آئین کی پابندی ہی میں فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے۔ جس نے قانون کی اطاعت کی وہ سعادت سے بہرہ ور ہوا لیکن جس نے آئین کو توڑا اس نے خودی کے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔

نشو ونما کی راہ میں دوسری منزل ضبطِ نفس ہے جس سے مراد نفس کو قابو میں رکھنا اور اسے بے راہ روی سے بچانا ہے۔ یہ منزل ایسی کٹھن ہے کہ بڑے بڑے رستم اور زال بھی یہاں آکر رہ جاتے ہیں۔ حبِّ جاہ۔ حبِّ زر۔ حبِّ وطن۔ حبِّ اہل و عیال کو تیج دینا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

جب یہ دونوں منزلیں طے ہو لیتی ہیں تو انسان کامل انسان کا درجہ حاصل کر کے نیابتِ الٰہی کا اہل ہو جاتا ہے اور چار دانگ عالم میں فتح و نصرت کے پھریرے اڑاتا پھرتا ہے۔ اقبال کا کامل انسان شجاعت کا پتلا اور صداقت کا مجسمہ ہے۔ شرافت کی جان اور نیکی کی روحِ رواں ہے۔ اس کا سونا جاگنا خدا کے لیے وقف ہے اور وہ مذہب کا شیدائی ہے۔ اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے تنبیہ کرتا ہے پیغام دیتا ہے۔ بھیدوں کی تشکا ڈھاتا ہے۔ نیچر کی طاقتوں کا غلام بناتا ہے۔ زیردستوں کی حمایت کرتا ہے۔ زبردست کو سفاکی سے روکتا ہے کعبے کو لات و منات کی آلائشوں سے پاک کرتا ہے۔ اسرائیلیوں کو فرعون کے پنجے سے رہائی دلاتا ہے۔ دنیا کو فلاح و بہبود کی راہ دکھاتا ہے اور کائنات کے لیے سایۂ رحمت ثابت ہوتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں خدا کا نائب ہے جس کی حکومت کا ڈھنگ نرالا ہے۔ فرمایا ہے۔

خلافت بر مقامِ ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

پس خودی اوّل عرفانِ ذات پیدا کرتی ہے اور پھر معرفتِ الٰہی اور نیابتِ خدا کا حق ادا کرتی ہے۔ گویا اس کا سارا فلسفہ آپ کے اس ارشاد کے گرد گھوم رہا ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

اقبال خود بھی اسی منزل کے راہرو تھے اور وہ یہی چاہتے تھے کہ ملت کا ہر فرد اس شعور کو پا کر عرفانِ الٰہی کے مقام کو پائے کیونکہ انسان کی پیدائش کی غایت و اصلیت یہی ہے۔

© rasailojaraid.com